© rasailojaraid.com

اور کون استاد زیادہ سرگرم اور عملی حصہ لیتا ہے، یہ گفتگو سرتاسر معلوماتی ہوتی تھی اور اس طرح باتوں باتوں میں مختلف ممالک کے قدیم و جدید حالات و واقعات کے بارہ میں اُن حقائق کا علم ہو جاتا تھا جو صرف کتابوں کی ورق گردانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر بعض اوقات خیال ہونے لگتا تھا کہ یہ انسٹیٹوٹ ایک تعلیم گاہ کا ہے کہ یا مجلس اقوامِ متحدہ کا ایک دفتر ہے جو عالمِ اسلام کے احوال و کوائف کے لئے مخصوص ہو یہاں کسی زبان کے پڑھانے کا عجیب و غریب لیکن بے حد مفید اور مؤثر طریقہ ہے، مثلاً انسٹیٹوٹ کے ایک پروفیسر ایم، اے بار کر اُردو پڑھاتے تھے اور کلاس میں صرف ایک یہودی طالبِ علم "فریڈمان" تھا۔ مگر کس طرح؟ اُردو زبان کے مشہور ادیب خواجہ محمد شفیع دہلوی کو ساتھ لے کر کلاس روم میں بیٹھتے تھے، اگر کبھی خواجہ صاحب ہاتھ نہ لگے تو مجھے یا کسی اور ہندوستانی یا پاکستانی کو پکڑ لیا، اب بارکر صاحب کتاب میں سے کوئی سطر پڑھتے ہیں اور اس کے بعد الفاظ کا صحیح تلفظ بتانے کے لئے خواجہ صاحب یا جو کوئی بھی ہو، وہ اُس لائن کے ایک ایک لفظ کا صحیح تلفظ ادا کر کے طالبِ علم سے اُس کی مشق کراتا ہے۔ ڈاکٹر چارلس آڈم عربی پڑھاتے تھے، کلاس میں دو امریکن لڑکیاں تھیں، وہ بھی یہی کرتے تھے، تلفظ کی صحت کے لئے اپنے ساتھ ایک عرب پروفیسر ڈاکٹر الحسینی کو لے کر بیٹھتے تھے، اگر تلفظ کی صحت کے لئے کوئی اہلِ زبان اُستاد دستیاب نہ ہو تو کناڈا میں عام قاعدہ ہے کہ جو زبان آپ کو سیکھنی ہے اُس کے اسباق کی خاص خاص کتابیں چھپی ہوئی ہیں اور وہ سب اسباق ریکارڈوں میں بھرے ہوئے ہیں، اب استاد آپ کو جو سبق پڑھا رہا ہے، اُس کا ریکارڈ مشین میں لگا دے گا۔ اور ادھر استاد آپ کو لفظوں کے معنیٰ یا ہجے وغیرہ بتائے گا اور اُدھر ریکارڈ سے آپ کو اُن لفظوں کا صحیح تلفظ معلوم ہوگا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مشین ایک ہی لفظ کو بار بار دہراتی رہے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کان ایک اجنبی زبان کے لفظوں سے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔

زبان کی تعلیم کے اس ترقی یافتہ طریقہ کا اثر یہ ہے کہ آپ یہاں دو برس میں بھی کسی اجنبی زبان میں وہ درک حاصل نہیں کر پاتے جو وہاں چھ ماہ کی مدت میں حاصل کر لیتے ہیں، چنانچہ فریڈمان کو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے اُردو کی الف، بے شروع کی تھی مگر آٹھ ماہ کے قیام کے بعد جب میں وہاں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلا ہوں تو یہ اچھی خاصی اُردو بولنے اور پڑھنے لگے تھے، اسی شوق کی تکمیل کے لئے اب ان کا ارادہ ہندوستان آنے کا ہے، آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ فریڈمان اُردو زبان اُس وقت سیکھ اور پڑھ رہے ہیں جبکہ جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، اور عربی اور ساتھ ہی عبرانی یہ پانچ زبانیں بالفعل وہ ایسی جانتے ہیں کہ اُن میں بے تکلف اور روانی کے ساتھ بولتے اور لکھ پڑھ سکتے ہیں، یہ حال تو زبانوں کے جاننے کا ہے، علمی استعداد کا یہ عالم ہے کہ یونیورسٹی کے مضامین کے علاوہ قرآن و حدیث، اور عربی شعر و ادب اور تاریخ پر بھی بڑی اچھی نظر ہے، یہ میرے دونوں سیمیناروں میں بحیثیت ام، اے کے طالبِ علم کے شریک ہوتے تھے، جب کبھی بحث میں حصہ لیا معقول طریقہ سے لیا۔ اور جب کبھی کوئی بات کہی حوالہ سے کہی، ایک دن میں نے اکبر الہ آبادی کی شاعری پر تقریر کی تو اس موقعہ پر سب سے زیادہ مشکل کام میرے لئے اکبر کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنا اور اُن اشعار میں جو صنائع بدائع یا اور دوسرے قسم کے لفظی محاسن آتے ہیں اُن کا برقرار رکھنا تھا۔ یوں گرپڑ کے کرنے کو میں نے کیا مگر مجھے خود اطمینان نہیں تھا کہ اس ترجمہ کے ذریعہ میرے مغربی سامعین و سامعات اکبر کی حقیقی شاعرانہ عظمت کا ادراک کر سکیں گے، لیکن میں نے دیکھا کہ فریڈمان نے کلام کے اصل جوہر کو آسانی سے سمجھ لیا اور اُس سے خوب لطف لیا۔ چنانچہ اکبر کے بعض مصرعے ان کی زبان پر چڑھ گئے، جب وہ انہیں امید و بیم کی دوگونہ صوتی کیفیت کے ساتھ پڑھتے تھے تو مجھے وہی لطف آتا تھا جو قاآنی کو اپنے ہکلے معشوق کے ساتھ بات کرنے میں آتا ہوگا۔

یہ حال تو شاگرد کا تھا۔ اب ان کے اُردو کے جو استاد تھے اُن سے بھی ملاقات کرتے چلئے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جس بدنصیب زبان کو خود اُس کے اپنے وطن میں جینے کے لالے پڑے ہیں اُس کے ساتھ نو ہزار میل دور کے فاصلہ پر ایک غیر قوم کیا سلوک کر رہی ہے، ڈاکٹر ام، اے بارکر اصلاً امریکن خاص واشنگٹن کے آس پاس کسی مقام کے رہنے والے ہیں، یہاں سے بی، اے کرنے کے بعد کلیفورنیا سے پی، ایچ، ڈی کیا، لسانیات اُن کا خاص مضمون ہے اس تقریب سے عربی اور فارسی اور اُردو کو شامل کرکے دس بارہ زبانیں جانتے ہیں، امریکہ میں سُرخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستانی نام سے جو ایک نیم مہذب قوم آباد ہے بارکر صاحب نے انہیں لوگوں کی زبان کی گرامر تیار کی ہے اور یہی ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع تھا۔ مضمون کے ساتھ عشق اور شغف کا یہ حال ہے کہ ۱۹۵۹ء میں انہیں امریکہ اور برطانیہ دونوں کی طرف سے ایک بڑا معقول وظیفہ تین برس کے لئے ملا۔ اور یہ اپنی بیوی کے ساتھ اردو پڑھنے اور سیکھنے کے لئے پہلے پاکستان، پھر ہندوستان بھی آئے۔ ہند میں ایک طرف لکھنؤ اور دلی کے کتب خانوں کی خاک چھان کر اُردو زبان کی بہت پرانی اور بوسیدہ نظم و نثر کی کتابوں کا ایک عظیم انبار ہزاروں روپیہ کی قیمت میں خریدا اور دُوسری جانب انھوں نے حیرت انگیز (ہم ایسے علم کے قدر ناشناس لوگوں کے نقطۂ نظر سے) کارنامہ یہ کیا کہ اڑیسہ کے شہر کٹک کے حوالی و اطراف میں جو غیر مہذب قبائل ہیں اُن کی زبان سیکھنے کے شوق میں بارکر صاحب نے حکومتِ ہند سے اجازت لی اور چار پانچ مہینے ان قبائل میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے، یہاں ان لوگوں سے ایسے گھل مل کر رہے کہ گویا یہ بھی اُن کے کوئی عزیز یا رشتہ دار تھے، ذرا تصور کیجئے! امریکہ کا ایک شخص جو عیش و آرام کی اعلیٰ زندگی بسر کرنے کا عادی ہے سخت گرمی کے موسم میں ان قبائل میں آکر ایک دو دن نہیں مسلسل چار پانچ مہینے رہتا ہے، انہیں کے کھانے کھاتا ہے اور اُنہیں کی طرح چٹائی پر بیٹھتا اور کھاٹ پر سوتا ہے، جسمانی طور پر اس پر کیا کچھ نہ گذری ہوگی! نتیجہ یہ ہوا کہ صحت بہت گر گئی اور یہیں سے اُن کو سخت قسم کی پیچش کا ایک ایسا عارضہ ہو گیا ہے جس نے اب تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بارکر صاحب نے ان قبائل میں قیام کا ایک پورا فلم تیار کر لیا ہے جو انھوں نے ایک دن ہم سب کو انسٹیٹوٹ میں دکھایا بھی تھا۔ بارکر صاحب سے میرے خصوصی تعلقات چند روز میں ہی اس حد تک ہو گئے تھے کہ میں ان کو بارکر بھیا اور وہ مجھے سعید بھائی کہتے تھے، یہ فلم دیکھ کر میں نے کہا "بھیّا! کیا عجیب بات ہے کہ آج آپ کے طفیل وطن سے اس قدر دُور میں خود اپنے ملک کے وہ علاقے اور ان علاقوں میں رہنے والے اُن لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جنھیں آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بارکر صاحب نے جو یہاں کیا تھا وہی پاکستان میں کیا۔ یعنی پشاور کے قرب و جوار میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو قبائل آباد ہیں اُن میں اور دوسری طرف بلوچیوں میں جاکر رہے اور اُن کی زبانوں سے واقفیت بہم پہونچائی، وظیفہ کی اس طرح تین برس کی مدت پوری کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں جب بارکر مونٹریل واپس پہونچے ہیں تو اس شان کے ساتھ کہ اُردو کی قدیم و جدید اور ساتھ ہی پشتو بلوچی زبان کی کتابوں کا ایک بڑا وسیع کتب خانہ، انڈو پاک کی پرانی مسلمانوں کی تہذیبی یادگاروں کے نوادر، مثلاً حقے، چلمیں، تلوار اور خنجر، کچھ آلات موسیقی اور کچھ سامانِ آرائش یہ سب چیزیں ان کے ساتھ تھیں، یہ اپنے ساتھ اُردو زبان کے قدیم شعرا کے کلیات و دواوین بھی لائے تھے جواب کہیں کسی قیمت پر نہیں ملتے، اس لئے ہمارے انسٹیٹوٹ نے چاہا کہ وہ اس تمام ذخیرہ کو اُن سے اپنی لائبریری کے لئے خرید لے اور اُس کے معاوضہ میں ہزاروں روپیہ کی گرانقدر رقم پیش کی، مگر بارکر صاحب نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ یہ سب میرے اپنے شوق کی چیزیں ہیں، میں اپنے گھر میں انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اس لئے اپنے سے جدا نہیں کرسکتا۔

بارکر صاحب نے امریکہ کے ایک تعلیمی فنڈ کی امدادِ خاص سے امریکہ اور یورپ میں اردو شعر وادب کو متعارف کرنے کی غرض سے ایک منصوبہ بنایا ہے جو انسٹیٹوٹ کے زیرِ انتظام اور بارکر صاحب کی نگرانی میں دو برس سے چل رہا ہے خواجہ محمد شفیع دہلوی جو دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اسی منصوبے کے سلسلہ میں بلائے گئے تھے، وہاں جو کام ہوتا ہے کس باقاعدگی اور خوبی سے ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اسی اُردو منصوبہ کے سلسلہ میں بارکر صاحب نے پہلے بزمانۂ قیام لاہور خواجہ صاحب کی مدد سے جدید شعراء کا ایک مختصر انتخاب[1] "محفل" کے نام سے شائع کیا اور پھر اس کتاب کے الفاظ کا ایک لغت انگریزی میں تیار کرنے کا ارادہ کیا تو ہر ہر لفظ کا کارڈ الگ بنایا، اس طرح کتاب اگرچہ مشکل سے متوسط تقطیع کے سو صفحات

---

[1] یہ انتخاب مجھے بالکل پسند نہیں آیا اور میں نے اس کا اظہار دونوں سے کر بھی دیا، بارکر صاحب نے معذرت میں یہ کہا کہ میں نے لاہور میں یہ عہد کر لیا تھا کہ جن جدید شاعروں سے میں ملاقات کروں اور ان کا کلام سنوں گا انتخاب میں انہیں کا کلام شامل کروں گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ہوگی مگر کارڈ اس قدر کثیر تعداد میں تیار ہوئے کہ چھ سات بکس (CARD BOX) بھر گئے، اب خواجہ صاحب اور بارکر صاحب دونوں کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر ایک ایک کارڈ لیتے تھے اور لفظ کے معنی یا معانی اور اس کا محلِ استعمال انگریزی میں لکھتے جاتے تھے، خواجہ صاحب خود اُردو زبان کے نامور ادیب اور انشاپرداز ہیں مگر گاہ بگاہ مجھ سے بھی مشورہ کرتے رہتے تھے اور از راہِ حسنِ ظن فرماتے تھے کہ "جب تک اس طرح کے الفاظ کے بارہ میں آپ سے مشورہ نہیں کر لیتا مجھے اطمینان نہیں ہوتا" اس قسم کے مواقع پر میں نے اگر بہ طورِ استشہاد کسی مستند شاعر کا کوئی شعر بھی سنا دیا تو بڑے خوش ہوتے تھے، جب یہ لغت مکمل ہوگیا تو اب بارکر صاحب نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا، اس کام کے علاوہ اس منصوبہ کا دوسرا کام یہ تھا کہ اُردو زبان کے اخبارات کی زبان کا ایک الگ لغت انگریزی میں تیار کیا جا رہا تھا، تیسرا کام یہ تھا کہ اُردو کی قدیم کتابیں جو دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بڑا قیمتی خزانہ ہیں اُن کا اُردو ٹکسٹ مع اُن کی شرح کے چھاپا جائے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ ٹکسالی زبان جو اب معدوم ہوتی جارہی ہے کسی طرح محفوظ ہو جائے، اس سلسلہ میں بارکر صاحب کی تجویز پر خواجہ صاحب لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب کا دیوان مع اُس کی شرح کے مرتب کر رہے تھے، پھر اسی سلسلہ میں ایک کام یہ بھی پیشِ نظر تھا کہ انگریزوں کو اُردو پڑھانے کے لئے پہلے زمانہ میں "منشی" صاحبان نے جو ریڈر لکھے تھے وہ زبان اور قواعد کے اعتبار سے بھی غلط ہیں اور اتنی مدت گذر جانے کے باعث یوں بھی اب چنداں مفید نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے بجائے نئے طرز کی اور زبان و قواعد کی صحت کے ساتھ اس مقصد کے لئے جدید کتابیں لکھی جائیں۔ بارکر صاحب نے یہ پورا منصوبہ امریکہ کے مذکورۂ بالا تعلیمی فنڈ کمیٹی کو لکھ کر بھیجدیا، اور وہاں سے بغیر کسی دقت اور دشواری کے منظوری آگئی۔

سُنا آپ نے! خلق میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ ہائے! " عالم ہمہ افسانۂ ما ما ہمہ ہیچ "

بارکر صاحب کا تعارف نامکمل رہے گا اگر یہ بھی نہ بتا دیا جائے کہ وہ اگرچہ امریکن نژاد ہیں اور اُنکا آبائی مذہب مسیحیت تھا مگر ۱۹۵۲ء میں جب پہلی مرتبہ وہ ہندوستان آئے تھے تو لکھنؤ میں مسلمان ہو گئے تھے، اب وہ مسلمان ہیں تو ایسے پختہ عقیدہ کے اور ایسے سچے کہ خدا ہر مسلمان کو کرے، نماز روزہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تلاوت قرآن کے پابند ہیں۔ محرمات سے مجتنب اور ان سے نفور ہیں۔ چہرہ پر مولانا ابو الکلام آزاد کے طرز کی ڈاڑھی بھی ہے، حبیب اللہ خاں صاحب جو پٹنہ کے رہنے والے ہماری علی گڈھ یونیورسٹی کے پرانے گریجویٹ اور اب بارہ برس سے حکومت کناڈا کے محکمۂ مالیات میں ایک اعلیٰ افسر اور وہیں کے شہری بن گئے ہیں اور بڑے دیندار اور اللہ والے ہیں بارکر صاحب نے انھیں کی صاحبزادی عنبرین سے شادی کی ہے اور میاں بیوی دونوں ۶۲ء میں (وظیفہ کی مدت پوری کرکے پاکستان سے لوٹتے ہوئے) حج اور زیارت حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کرچکے ہیں، ایم، اے، آر بارکر کا مطلب پہلے تو معلوم نہیں کیا تھا! اب اس سے مراد ہے محمد عبد الرحمٰن بارکر۔

حج کے سلسلہ میں جدّہ میں ان کے ساتھ ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا! چونکہ اُن کے پاس امریکن پاسپورٹ تھا اور اس میں اُن کا نام ام، اے، آر بارکر ہی لکھا ہوا تھا اس لئے سعودی عرب کے افسرانِ کسٹم کو ان پر امریکہ کے جاسوس اور عیسائی ہونے کا شبہ ہوا اور ان کو حجاز میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ جب انھوں نے کہا کہ میں تو مسلمان ہوں اور بیوی کے ساتھ حج کرنے آیا ہوں! تو عرب افسروں نے پوچھا "اچھا! نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟" انھوں نے نماز پڑھی اور قرآن کی ایک دو سورتیں بھی تلاوت کیں، پھر کچھ عربی بھی بولے، مگر ان لوگوں کا شبہ دور نہیں ہوا، آخر بارکر صاحب مصری سفارت خانہ کے ایک افسرِ اعلیٰ کو بلا کر لائے جو ذاتی طور پر انہیں خوب جانتا تھا۔ جب اس افسر نے آکر اُن کے مسلمان ہونے کی شہادت دی تب ان کی گلوخلاصی ہوئی۔ بارکر صاحب اُردو پڑھاتے تھے، اُردو بولتے اور لکھتے تھے اور اُردو منصوبہ کے ڈائرکٹر بھی تھے لیکن زبان داں نہیں تھے، اس لئے اُن سے بربنائے بے تکلفی چھیڑ چھاڑ بھی رہتی تھی، ایک مرتبہ میں نے شعر پڑھا:۔

ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا ؛ آپ سے میل ہی نہ تھا گویا

اور بارکر صاحب سے اس کا مطلب پوچھا تو چکرا گئے، اور مطلب نہ بتا سکے خواجہ صاحب کو اس پر جو طیش آیا تو انھوں نے فوراً جان صاحب کا ایک شعر پڑھا جس میں "مہندی کا چور" فقرہ آیا تھا اور مجھ سے اس کا مطلب پوچھا تو اب بارکر صاحب کی طرح میں بھی بغل جھانکنے لگا، اس پر ہم تینوں خوب ہنسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور آخر خواجہ صاحب نے فرمایا "عورتیں ہاتھ میں جب مہندی لگاتی ہیں تو ہتھیلی کا درمیانی حصہ ایک چھوٹے دائرہ کی شکل میں سادہ رہ جاتا ہے۔ بس اسے مہندی کا چور کہتے ہیں، اس کے بعد خواجہ صاحب نے حسرت سے کہا کہ میرے جیسے چند ایک لوگوں کے بعد کوئی دیوان جان صاحب جیسی کتابوں کی زبان کو سمجھنے والا بھی نہیں رہے گا، اسی لئے میں یہ دیوان اڈٹ کر رہا اور اس کی شرح لکھ رہا ہوں، ورنہ اس میں ہمارے سماج کے گذشتہ اخلاق اور تہذیب کی جو بدنما اور شرمناک تصویریں نظر آتی ہیں ان کی وجہ سے یہ کتاب ہرگز اس لائق نہیں کہ اسے یورپ اور امریکہ کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

اُردو کا ذکر چل رہا ہے اور خواجہ صاحب کا نام آیا ہے تو اتنا اور سُن لیجئے کہ خواجہ محمد شفیع، خواجہ عبدالمجید صاحب کے صاحبزادہ اور دلّی کے قدیم شرفاء کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اللہ نے انہیں سب کچھ ہی دے رکھا تھا، نواب کہلاتے اور نوابوں کی طرح ہی رہتے تھے، دلّی کی خاص ٹھیٹ اور ٹکسالی زبان میں لکھنے اور بولنے کا جو ملکہ قدرت نے باپ بیٹے کو بخشا تھا دلّی میں گنے چنے چند ہی آدمی تھے جو اس کمال میں ان کے حریف ہونے کا دعویٰ کر سکیں، خواجہ محمد شفیع نے ایک دو نہیں ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، ان کتابوں کی زبان و بیان کا کیا کہنا! بس پڑھتے جائیے اور جھومتے جائیے، یہ بھی زمانہ کا عجیب انقلاب ہے کہ آج ترقی پسند ادب اور تنقیدی لٹریچر کی فراوانی نے انڈو پاک کا مذاق اس درجہ بدل دیا ہے کہ خواجہ صاحب جیسے ادیب و نکتہ شناسِ زبان کا ذکر آپ کو موجودہ زمانہ کی کسی تاریخِ ادب اُردو میں یا اس زبان کے نامور ادیبوں کی فہرست میں نظر نہیں آئے گا۔ خواجہ صاحب یُوں بھی اپنی ذات سے بڑے باغ و بہار اور گل دل آدمی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں اپنی لاکھوں روپیہ کی جائیداد، اپنا مکان نہیں بلکہ محل سب چھوڑ چھاڑ پورے گھرانہ کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے، وہاں نہ اُن کی نوابی رہی اور نہ وہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی، مزاج میں تمکنت اور خودداری بلا کی ہے۔ جو نقد روپیہ اپنے ساتھ لائے تھے اُسی پر گذر بسر کرتے رہے، پاکستان میں بڑے بڑے امراء، وزراء، اور حکام ان کے ملنے والے اور شناسا تھے، مگر اُن کی آنکھیں بدلی ہوئی دیکھی تو یہ بھی خانہ نشیں ہو گئے، کسی کی خوشامد یا چاپلوسی ان کی فطرت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعید تھی، دلی میں خواجہ صاحب کی زندگی بڑی رنگیلی اور بڑے عیش و آرام میں گذری ہے، لیکن ساتھ ہی دینی حمیت و غیرت، شرافتِ اخلاق، اور نماز روزہ کی پابندی اُن کا شعار رہی ہے، پاکستان میں اپنی نوابی کے ختم ہو جانے کا تو انہیں چنداں ملال نہیں ہوا، لیکن پاکستان میں حکومت اور اُس کے بعض اعیان وارکان کے ہاتھوں اسلامی اقدار کی پامالی و زبوں حالی دیکھی تو برداشت نہ کر سکے، گھر میں بند ہو کر قلم لے کر بیٹھ گئے اور چند مہینوں میں دو ہزار کے لگ بھگ صفحات لکھ کر دم لیا اِس سلسلہ کی پہلی جلد "زیبا" کے نام سے ایک ناول کی شکل میں چھپ کر کئی برس ہوئے شائع ہو چکی ہے، پاکستان میں موجودہ حکومت کے قیام سے پہلے خود غرض اور مغرب زدہ حکمرانوں کے ہاتھوں اس ملک میں اخلاقی انارکزم کا کیا عالم تھا! وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اس کی دردناک کہانی اور خواجہ صاحب کا خاراشگاف و شعلہ فشاں قلم! حکومت کے ایوانوں میں بھونچال آگیا، وہ تو خیر یہ ہوئی کہ حکومت میں انقلاب آگیا، ورنہ سکندر مرزا برسرِ اقتدار رہتے تو خواجہ صاحب کی گرفتاری یقینی تھی، وہ خود فرماتے تھے کہ میں نے جب یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو والد صاحب قبلہ حیات تھے اور اُن سے اجازت لینی ضروری تھی، چنانچہ میں نے ایک دن صبح کو ناشتہ کے بعد عرض کیا کہ مجھ سے اب اسلام کی رسوائی برداشت نہیں ہوتی اور میں ایک ضخیم کتاب لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں، والد صاحب نے فرمایا "تم نے اس کے انجام پر غور کر لیا ہے؟" میں نے کہا جی ہاں! میں اس کے عواقب و نتائج پر خوب غور کر چکا ہوں"، والد صاحب نے پوچھا کہ "اچھا! اگر تم یہ کتاب نہ لکھو تو کیا ہوگا؟" میں نے جواب دیا "میں پاگل ہو جاؤں گا" یہ سنتے ہی والد صاحب نے فرمایا "اگر یہ بات ہے تو اب میں تم سے کہتا ہوں کہ ضرور لکھو خدا تمہاری مدد کرے" کتاب میں اگرچہ حکومت کے بعض اعیان وارکان پر تنقید ہے اور بہت سخت اور بڑی کڑی۔ اور ان لوگوں کا اس سے برافروختہ ہونا طبعی تھا۔ لیکن چونکہ لب و لہجہ کی شدت اور تیزی کے باوجود کتاب میں خلوص، اسلامی درد اور پاکستان کے ساتھ محبت اُس کی سطر سطر سے نمایاں ہے اسلئے عوام و خواص میں اُس کا بڑا چرچا ہوا اور عام طور پر اُسکو داد ملی۔

خواجہ صاحب جتنے بڑے ادیب اور زباں داں ہیں مذہبی خیالات و افکار میں اتنے ہی کٹر ہیں، مونٹریل میں قیام کے زمانہ میں سفر ہو یا حضر، تندرست ہوں یا بیمار مجال نہیں تھی کہ ایک وقت کی نماز یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید کی تلاوت بھی ناغہ ہو جائے، سفر میں جا رہے ہیں بس میں بیٹھے ہوئے ہیں، نماز کا وقت ہو گیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ ڈالی، میں ایسے موقع پر جمع بین الصلوٰتین کرتا تھا، مگر وہ کہتے تھے کہ اگر منزل پر پہونچنے سے پہلے ہی موت آ گئی تو پھر کیا ہوگا؟ اچھے اچھے لوگ ڈاڑھی کے ساتھ یورپ و امریکہ پہونچتے ہیں تو کچھ دنوں کے بعد آئینۂ تمثال غیر طبعی بن جاتے ہیں لیکن خواجہ صاحب کا معاملہ اس کے برعکس ہوا، وہاں پہونچے تو ڈاڑھی مونچھ صاف تھی مگر دو ماہ کے بعد ہی چہرہ خدا کے نور سے جگمگا اٹھا، میں اور خواجہ صاحب ہم دونوں خواجہ تاش ہیں یعنی دلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج میں انھوں نے بھی تعلیم پائی اور میں نے بھی، انھوں نے بی، اے کے بعد تعلیم ترک کر دی اور میں نے ایم، اے کیا اور پھر وہیں کالج میں ملازم ہو گیا، اس بنا پر ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف اور شناسا تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپس میں کچھ زیادہ خلا ملا اور ربط و ضبط نہیں تھا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں قرولباغ میں رہتا تھا اور خواجہ صاحب جامع مسجد کے علاقہ مٹیا محل میں علاوہ ازیں خواجہ صاحب اُس زمانہ میں جو صد رنگ بکنار زندگی بسر کرتے تھے میں اُس میں ان کا شریک و سہیم نہیں بن سکتا تھا، لیکن حسن اتفاق سے ایک عرصۂ دراز کے بعد قدرت نے ہم دونوں کو پردیس میں اس طرح یکجا کر دیا تو اب ہم میں ایسی گاڑھی چھنی کہ ساری عمر کی تلافی ہو گئی، انسٹیٹوٹ سے تعلق کے علاوہ خواجہ صاحب ایک کمرہ الگ کرایہ پر لے کر رہتے تھے، اُن کا یہ کمرہ میرے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلہ پر ہی تھا۔ اور اس تقریب سے مغرب اور عشاء کی نمازیں اکثر و بیشتر ہم دونوں ایک ساتھ جماعت سے پڑھتے تھے، خواجہ صاحب ایک بلبل ہزار داستان ہیں، بولتے ہیں تو مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں، دلّی کی بیگمات کے محاورے، وہاں کی بھنگنوں اور بھٹیارنیوں کی گالیاں اور یارانِ سرپل کی نوک جھونک جب یہ چیزیں سنانے پہ آتے ہیں تو ویرانہ سے ویرانہ کو لالہ زار بنا دیتے ہیں، ضلع، جگت فقرہ بازی اور ملاحی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے، خواجہ صاحب میں ایک کمی یہ ہے کہ انھیں اشعار یاد نہیں رہتے اور مجھے بچپن سے ہزاروں شعر یاد ہیں، اس لئے جب کبھی میں خواجہ صاحب کی فقرہ بازی کا نشانہ بنتا تھا اور میں ان کی زبان میں جواب دے نہیں سکتا تھا تو میں اپنی اس کوتاہی کی تلافی چند برمحل شعر پڑھ کر کرتا تھا، خواجہ صاحب یہ شعر سُن کر لوٹ پوٹ ہو جاتے، بڑے زور کا قہقہہ لگاتے اور پھر حسب عادت بڑی محبت سے دعائیہ کلمات ادا کرتے تھے، خدا اُنھیں خوش و خرم رکھے، انھوں نے چند مہینوں میں اتنا ہنسایا اور اتنے قہقہے لگوائے ہیں کہ برسوں میں ان کی نوبت نہیں آتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پندرہ روزہ دورۂ روس کی روئداد

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

(۳)

بسلسلۂ اشاعت ماہ نومبر ۶۳ء

رات کا کھانا ہندوستانی سفیر کول صاحب کے یہاں تھا، سفیر صاحب نے ہمارے ساتھ ہمارے میزبانوں اور بعض خاص اخباری نمائندوں کو بھی مدعو کیا تھا، مسٹر کول بڑے شائستہ، مہذب اور شریف شخص ہیں، پرانی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہندوستان کے خاص تحفے پان کی جگہ لکھنؤ کا مشہور مسالہ استعمال کرتے ہیں، مسالہ کا ایک پیکٹ انھوں نے امام صاحب کو بھی دیا، امام صاحب پان کے زیادہ عادی تو نہیں ہیں مگر اس برگِ سبز کو کبھی کبھی یاد ضرور کرتے ہیں، سفیر صاحب نے ان کے چہرہ سے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا، اسی کے ساتھ ہمارے میزبانوں کو ہماری طرف سے اعلیٰ درجہ کی ہندوستانی چائے کے پیکٹ تحفے کے طور پر دیئے، ان کے یہاں دو تین گھنٹے خوب مجلس رہی، اور مختلف مسائل پر دوستانہ تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اور ہاں عدم گنجائش اور عجلت کی وجہ سے ماسکو کی لینن لائبریری کا ذکر کرنا بھول گیا، اور اچھا ہی ہوا کہ بھول گیا، دنیا کی اس اوّل درجہ کی لائبریری کا ذکر کرتا بھی تو کن لفظوں میں کرتا، کہتے ہیں پوری دنیا میں دو لائبریریاں سب سے بڑی ہیں (۱) واشنگٹن (امریکہ) کی لائبریری (۲) ماسکو کی لائبریری، مگر روزانہ کے اوسط سے جتنے آدمی ماسکو کی لائبریری میں آتے ہیں امریکہ کی لائبریری میں نہیں آتے، لائبریری کے اس سمندر میں روزانہ کم سے کم ایک ہزار نئی کتابیں داخل ہوتی ہیں اور ایک ہفتے تک ایک ہال میں ابتدائی اور سرسری مطالعہ کیلئے رکھی رہتی ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد ترتیب میں چلی جاتی ہیں، ایک قدیم اور لائق کارکن نے جن کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا بڑے اطمینان اور سلیقے سے ہمیں لائبریری کی کچھ اُچٹتی ہوئی پرچھائیاں دکھائیں، کیوں کہ ہمارے پاس وقت نہیں تھا، کئی گھنٹے صرف کرنے کے باوجود صرف حصۂ مخطوطات اور فہرستوں کے کمروں میں جاسکا، حصۂ مخطوطات میں عجائب وغرائب دیکھے، وہاں پہونچا تو فلسفۂ اسلامی کی ایک کتاب کا جس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں رہا فوٹو لیا جارہا تھا، لائبریری میری دل چسپی اور خاص ذوق کی چیز تھی مگر وقت کی قلت کا شکوہ کرتا ہوا واپس آگیا، کئی سال ہوئے مُحِبّی مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے اسی لائبریری کے لئے ماسکو کا سفر کیا تھا، اُس کی وسعت اور دوسری خصوصیتوں کی کیفیت اُن سے دریافت کیجئے گذشتہ چند سال میں قدرتی طور پر اس کی توسیع و ترقی میں اور اضافہ ہونا ہی چاہئے تھا، ماسکو یونیورسٹی کی لائبریری بھی قابلِ دید ہے مگر ہم لوگ اس کے بہت تھوڑے سے حصے میں یوں ہی گذرے تھے!

کرملین کے تاریخی محل اور اُس کی ذہنی اور روایتی دیوارِ آہنی کے دیکھنے کا بھی شوق تھا، اس شوق کو بھی پورا کیا اور اس کی عجوبہ کاریوں کی سیر کی، سُرخ اینٹوں کی اس آہنی دیوار کے اندر گئے تو ماضی کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا، اب یہ اسٹالن کے زمانے کا کرملین نہیں ہے، خروشچیف کے دَور کا کرملین ہے جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حکومت اور اس کے کاروبار کے لئے چند خاص عمارتیں کافی ہیں، محل کی وسعتوں اور اس کے عجائبات کو عام پبلک کے لئے کیوں بند کیا جائے، ہم نے اِن عجائبات پر نگاہِ عبرت ڈالی، اور انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کے روس کا موازنہ کرنے لگے، کرملین کے وسیع وعریض احاطے میں جتنے گرجا گھر ہیں اب اُن کا استعمال عبادت گاہ کے طور پر نہیں ہے، سچ یہ ہے کہ ہم نے یہ تاریخی مقام خاص وزیٹرز کی حیثیت سے نہیں عام سیّاحوں کی طرح دیکھا، خاص خاص چیزیں خاص مہمان کی حیثیت سے دیکھتے تو اس کے لئے وہی وقت کا سوال تھا، چنانچہ ہماری کاریں محل کے ایک دروازے پر کھڑی رہیں اور ہم پاپیادہ گھومتے رہے، اور عام آدمیوں کی طرح جتنا کچھ دیکھ سکتے تھے دیکھا، محل کے باہر میدان میں ایک سُرخ سنگین، زمین دوز عمارت ہے، اس میں لینن کی لاش جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔ یہاں پُرہیبت فوجی پہرہ رہتا ہے، پہرہ داروں کی ڈیوٹی ہر گھنٹے بدلتی ہے اور ردّوبدل اور انتظام میں اعلیٰ درجہ

© rasailojaraid.com